عقل، فطرت اور ایمان

سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501

www.tanzeem.org

عقل، فطرت اور ایمان

سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم

امّا بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ
وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ
سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ۭ
وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ
اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ
الْاَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۭ
اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿١٩٤﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ
عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا
وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ
عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾﴾ (آل عمران)...... صدق اللّٰہ العظیم

اِن صفحات میں قرآن مجید کے جس منتخب نصاب کی مختصر اور عام فہم توضیح وتشریح کا سلسلہ چل رہا ہے اس کے ضمن میں بفضلہٖ تعالیٰ پانچ اسباق یعنی سورۃ العصر، آیۂ برّ، سورۂ

لقمان کا دوسرا رکوع‘ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ اور سورۃ الفاتحہ کی اجمال کے ساتھ تشریح ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کا چھٹا سبق سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات (۱۹۰ تا ۱۹۵) پر مشتمل ہے۔ آیئے پہلے ہم ان آیاتِ مبارکہ کے ایک سلیس و رواں ترجمے پر نظر ڈال لیں تاکہ ان میں جو مضامین ومباحث آ رہے ہیں ان کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آ جائے۔ ان آیات کا ترجمہ ہے:

’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند (اور باشعور) لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور وفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ (وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے‘ تو اس سے پاک ہے‘ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ربّ ہمارے! جسے تو نے آگ میں داخل کر دیا اسے تو تُو نے رسوا کر دیا‘ اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ اے ربّ ہمارے! ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار کو سنا کہ وہ ایمان کی دعوت دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر‘ پس ہم ایمان لے آئے۔ سو اے ہمارے ربّ! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دُور فرما دے اور ہمیں نیکوکار بندوں کے ساتھ وفات دیجیو۔ اور اے ربّ ہمارے! ہمیں عطا فرما جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اپنے رسولوں کی وساطت سے‘ اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔ یقیناً تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ پس ان کی دعا قبول فرمائی ان کے ربّ نے کہ میں تو کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں‘ خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔ تو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں اور جنہوں نے جنگ کی اور جنہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں‘ میں ان کی برائیوں کو لازماً ان سے دُور کر دوں گا اور اُن کو لازماً داخل کروں گا اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ بدلہ ہو گا اللہ کے خاص خزانۂ فضل سے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے‘‘۔

چند تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ ہم ان آیاتِ مبارکہ میں وارد مضامین پر سلسلہ وار غور کریں‘ مناسب ہوگا کہ اب تک کے معمول کے مطابق چند تمہیدی باتیں سمجھ لیں۔

زیرنظر آیات کی عظمت وفضیلت

سب سے پہلی بات جو قرآن مجید سے ذہنی مناسبت پیدا کرنے میں ممدّ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی طویل سورتوں میں سے اکثر و بیشتر کے آغاز اور اختتام پر جو آیات وارد ہوتی ہیں وہ بالعموم نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ بات عام دُنیوی ادب کے اصول کے مطابق بھی ہے۔ جیسے کسی قصیدے یا غزل کے مطلع اور مقطع کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کسی قادر الکلام خطیب کے خطبہ کے افتتاحی اور اختتامی کلمات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں‘ اسی طرح قرآن مجید کی اکثر طویل سورتوں کے آغاز اور اختتام پر وارد ہونے والی آیات بھی بہت جامع ہوتی ہیں۔ انہیں اصطلاحاً فواتح وخواتیم سُوَر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی اور آخری آیات کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہی وصف بتمام وکمال سورۂ آل عمران کی زیرنظر آیاتِ مبارکہ میں موجود ہے۔

ان آیات کی عظمت وفضیلت کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اِن دونوں روایات کو امام رازیؒ اپنی تفسیرِ کبیر میں لائے ہیں۔ پہلی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے‘ جسے ان آیات کا شانِ نزول بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان سے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ فرمائش کی کہ اے اُمّ المؤمنینؓ! مجھے آپ وہ واقعہ سنایئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال وواقعات میں آپ کو سب سے پیارا لگا ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک گہرے احساس کے ساتھ یہ فرمایا کہ ’’آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ساری ہی باتیں نہایت پیاری تھیں اور آپؐ کی تو ہر ادا دل آویز تھی‘ تاہم تم نے فرمائش کی ہے تو مَیں تمہیں ایک واقعہ سناتی ہوں۔ ایک شب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے‘ لیکن اچانک آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

''اے عائشہ! مجھے اجازت دو' میں اِس وقت اپنے اللہ کی عبادت کرنا چاہتا ہوں''۔ میں نے عرض کیا: حضورؐ! مجھے آپؐ کا قرب نہایت عزیز ہے' لیکن جو چیز آپؐ کو پسند ہو وہ اس سے بھی زیادہ محبوب ہے' لہٰذا آپؐ کو اجازت ہے۔ تو آپ ﷺ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور آپؐ پر رقت طاری ہوئی اور آپؐ روتے رہے' یہاں تک کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر آپؐ نے بہت طویل سجدہ کیا' اس میں بھی گریہ طاری رہا جس کی بنا پر سجدہ گاہ تر ہوگئی۔ پھر آپ ﷺ کچھ دیر لیٹے رہے' لیکن وہ کیفیت آپؐ پر برقرار رہی' یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی اور آپؐ پر رقت اور گریہ کی وہی کیفیت طاری رہی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی آنحضور ﷺ کی اس کیفیت کو دیکھا' تو انہوں نے عرض کیا: حضورؐ! آپؐ پر یہ رقت اور یہ گریہ کیسا؟ حالانکہ اگر بالفرض آپؐ سے کوئی خطا اور لغزش ہوئی بھی ہو تو اللہ تعالیٰ آپؐ کی تمام خطاؤں کو بخش دینے کا اعلان فرما چکا ہے۔ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے بلال! میں کیوں نہ روؤں کہ آج کی شب میں میرے ربّ نے مجھ پر یہ آیات نازل فرمائی ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝۱۹۰ ...... الخ﴾

دوسری روایت کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''نبی اکرم ﷺ کے معمول میں یہ شامل تھا کہ جب آپؐ رات کے وقت تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو آنکھ کھلتے ہی بے اختیار آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ آیات جاری ہو جاتی تھیں''۔ اب آپ چشمِ تصور سے دیکھئے کہ اللہ کا محبوب بندہ پچھلی رات کو اٹھا۔ اوپر آسمان ہے' ستارے ہیں اور ماحول پر تاریکی اور سکون کی کیفیت طاری ہے۔ اِس وقت جو واردات قلب پر طاری ہو رہی ہے اس کی بہترین ترجمانی مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ سے ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ کو اِن آیاتِ مبارکہ سے خصوصی شغف تھا۔

آیاتِ مبارکہ کا موضوع: ''ترکیبِ ایمان''

دوسری قابلِ غور بات اِن آیات کا موضوع ہے۔ ان آیات کے لیے موزوں عنوان ''ترکیبِ ایمان'' ہے۔ یعنی یہ کہ ایمان کیسے وجود میں آتا ہے اور ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت میں باہمی ربط اور ترتیب کیا ہے' اور خاص طور پر یہ کہ ایمان کے ضمن میں قرآن کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے! وہ کس انداز اور اسلوب سے ایمان باللہ کی دعوت دیتا ہے اور کن دلائل سے معاد یعنی آخرت کا اثبات کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اس ایمان کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں کیا کیفیات پیدا ہونی چاہئیں۔ یہ نہایت اہم موضوع ہے' اس لیے کہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے دین کی جڑ اور بنیاد ایمان ہی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہے کہ ایمان کے بارے میں چند بنیادی امور ذہن نشین کر لیے جائیں۔

ایمان کے بارے میں چند بنیادی امور

ایمان چند ماورائی حقائق اور چند امورِ غیبی کو مان لینے کا نام ہے۔ لیکن اس ایمان کے دو درجے ہیں' ایک درجہ قانونی اور فقہی ایمان کا ہے جس کی بنیاد پر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کا سارا دارومدار ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَان'' پر ہے۔ یعنی زبان سے اقرار کرنا کہ میں مانتا ہوں اللہ کو' اُس کی صفاتِ کمال کو' اُس کی توحید کو۔ میں مانتا ہوں آخرت کو' قیامت کو' بعث بعد الموت کو' حشر ونشر کو' حساب کتاب کو' جزا وسزا کو' جنت و دوزخ کو۔ اور میں مانتا ہوں نبوت و رسالت کو' ملائکہ کو' وحی کو' کتابوں کو' نبیوں اور رسولوں کو اور حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین والمرسلین ہونے کو۔ ان امور کا زبانی اقرار دُنیا میں ہمارے مسلمان ہونے کی بنیاد ہے۔ ایمان کا دوسرا رُخ' یا دوسرا پہلو یا دوسرا درجہ ہے حقیقی ایمان کا۔ اور وہ عبارت ہے قلبی یقین سے۔ یعنی ان تمام امور پر دل میں پختہ یقین پیدا ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی نام ہے ''تصدیقٌ بِالقلب''۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آخرت میں کامیابی و کامرانی اور فلاح و نجات کا دارومدار اس حقیقی و قلبی

ایمان پر ہے۔

جہاں تک پہلے ایمان یعنی اقرارٌ باللّسان کا تعلق ہے' اس کے بارے میں گفتگو کی ہمیں خاص حاجت نہیں ہے۔ وہ تو ہمیں موروثی طور پر مل ہی گیا ہے۔ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے تو وراثت میں یہ عقائد ہمیں منتقل ہو گئے۔ لیکن اصل چیز وہ یقینِ قلبی ہے جس پر آخرت میں نجات کا انحصار ہے۔ ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ یقینِ قلبی اور ایمانِ حقیقی ان آیات کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہیے کہ اگر ایک انسان جس نے مسلمان معاشرے میں آنکھ کھولی اور وہ دین کے اوامر ونواہی پر کاربند ہے تو چاہے ذہن' فکر اور شعور کی سطح پر اسے ان ماورائی حقائق اور امورِ غیبی کا حقیقی ادراک حاصل نہ ہو تب بھی اسلامی شعائر واحکام پر مسلسل عمل کرنے سے اس کو ایک نوع کے قلبی یقین کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح انسان کا باطن اس کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح اس کا ظاہری طرزِ عمل اور اس کا ظاہری رویہ بھی اس کے باطن پر عکس ڈالتا ہے۔ چاہے آپ اسے ایک غیر شعوری یقین کہہ لیں لیکن وہ ہوتی یقین ہی کی کیفیت ہے۔ تاہم ہمیں اِس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ ان آیات میں جو گفتگو ہو رہی ہے وہ اکتسابی اور شعوری ایمان کی ہے جس کو ایک ذہین وفطین اور صاحبِ شعور وادراک انسان اپنے ذاتی غور وفکر کے نتیجے میں حاصل کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اِن آیاتِ مبارکہ کی پہلی آیت میں ''اُولوا الالباب'' قرار دیا گیا ہے' یعنی ہوش مند لوگ' عقل سے کام لینے والے لوگ' صاحبِ خرد لوگ۔ ان لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش مند (اور باشعور) لوگوں کے لیے''۔

اُولوالالباب کے ذہنی وشعوری سفر کے ارتقائی مراحل

قارئین کرام ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ایک نگاہ ڈال لیں تو یہ نکات ان کے سامنے آئیں گے کہ اس رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ''اولوالالباب'' کے بارے میں اوّلین بات یہ سامنے آتی ہے کہ یہ لوگ کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے اللہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ذہنی اور شعوری سفر کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ کو پہچان لینے کے بعد اُس کی ذاتِ اقدس سے ایک مضبوط ذہنی رشتہ و تعلق استوار کر کے مزید غور وفکر کرتے ہیں اور بقول علامہ اقبال خرد کی مزید گتھیاں سلجھاتے ہیں تو ان کی رسائی ایمان بالمعاد یعنی ایمان بالآخرۃ تک ہو جاتی ہے۔ گویا معرفتِ الٰہی اور مکافات ومجازاتِ عمل اور اس کے لیے ایک دوسری زندگی کے منطقی لزوم تک رسائی ان کے اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور تعقل و تفکر کا حاصل ہوتی ہے۔ اس ارتقائی عمل کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب کسی نبی کی دعوت ایسے لوگوں کے کانوں میں پڑتی ہے جو اِن ہی امور پر مشتمل ہوتی ہے تو وہ والہانہ انداز میں اس پر لبیک کہتے ہیں۔

اس سبق کی آخری آیت (۱۹۵) میں ایسے لوگوں کے سیرت و کردار کی ایک جھلک دکھا دی گئی ہے کہ یہ لوگ بودے اور بزدل نہیں ہوتے' بلکہ جہاں عقل وشعور کے اعتبار سے پختہ ہوتے ہیں وہاں ان کا کردار اور ان کی سیرت بھی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات کو عقل وفطرت اور ذہن وقلب سے حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں اس کے لیے مال و منال' اہل وعیال' اعزّہ و احباب سب کچھ چھوڑنے حتیٰ کہ جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں اور وقت آنے پر بالفعل جان و مال کی بازیاں کھیل کر دکھاتے ہیں!

اس درس کے ضمن میں تیسری اور آخری تمہیدی بات اس کا ہمارے سابقہ دروس سے ربط و تعلق ہے۔ اس سلسلۂ دروس کے نقطۂ آغاز یعنی سورۃ العصر میں انسان کی نجات اور فوز وفلاح کی چار ناگزیر شرائط سامنے آئی تھیں: ایمان' عملِ صالح' تواصی

بالحق اور تواصی بالصبر ۔ یہی مضمون اپنی پوری جامعیت کے ساتھ مگر قدرے مختلف سیاق وسباق میں وارد ہوا تھا آیۂ بر میں بھی اور سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی ۔ اس تناظر میں یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان چار لوازمِ نجات میں سے ایمان اور صبر یعنی پہلی اور آخری شرائط کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ گویا درمیانی دو شرائط یہاں مقدر ہیں۔ پھر سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی شخصیت سامنے آ چکی ہے جو نہ نبی تھے اور نہ ہی کسی رسول کے اُمتی تھے' لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی رہنمائی میں وہ ایمان باللہ' التزامِ توحید اور اجتناب عن الشرک کے علاوہ قانونِ مجازات و مکافاتِ عمل تک بھی پہنچ گئے تھے۔ یہی مضمون سورۃ الفاتحہ میں سامنے آ چکا ہے کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے اور اسے جزا و سزا کا شعور بھی حاصل ہو جاتا ہے' لیکن پھر وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل و معاملات میں تفصیلی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے' جس کے لیے وہ اپنے ربّ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے کہ اے ہمارے ربّ! اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما!'' یہاں سے رسالت کی ضرورت کی دلیل قائم ہوتی ہے۔

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی پہلی پانچ آیات اس اعتبار سے قرآن حکیم کے اہم ترین مقام کی حیثیت رکھتی ہیں کہ ان میں عقل و فطرت کی رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی کے تدریجی عمل کے ان منطقی اور ارتقائی مراحل کا بیان نہایت اجمال کے ساتھ آ گیا ہے جو قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

زیر مطالعہ آیات کے بارے میں بعض تمہیدی باتوں کے بیان کے بعد اب ہمیں ان آیاتِ مبارکہ پر ذرا گہرائی میں غور و فکر کرنا ہے۔ اوّلاً ہم اپنی توجہات کو صرف تین آیات پر مرکوز رکھیں گے۔ اس کے لیے مناسب ہے کہ پہلے ان آیات کا ترجمہ ذہن نشین کر لیا جائے جو حسبِ ذیل ہے:

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند (اور باشعور) لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو بیٹھے اور کھڑے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) ہر حال میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ربّ ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک ہے (کہ کوئی کام بے کار اور بے مقصد کرے!) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ربّ ہمارے! بے شک جسے تو نے آگ میں داخل کیا اسے تو تُو نے پوری طرح رسوا کر دیا' اور ایسے ظالموں کا یقیناً کوئی مددگار نہیں''۔

''اولوا الالباب'' کون ہیں؟

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں ایمان کی ''ترکیب'' کا بیان ہو رہا ہے' لیکن عوام کے تقلیدی ایمان کا نہیں' بلکہ ہوش منداور صاحبِ عقل و شعور لوگوں کے اکتسابی اور شعوری ایمان کا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت میں ''اولی الالباب'' کی اصطلاح وارد ہوئی ہے' یعنی ''الباب والے''۔ ''الباب'' جمع ہے ''لُبّ'' کی۔ لُب کسی چیز کے اصل جوہر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم عام بول چال والی اردو میں بھی کہتے ہیں کہ ''پوری بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے''۔ گویا کسی شے کا اصل جوہر اس کا ''لُبّ'' کہلاتا ہے۔ اب غور کا مقام ہے کہ انسانیت کا اصل جوہر کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ اہل منطق اور اہل فلسفہ نے انسان کو ''حیوانِ عاقل'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا انسان کا خلاصہ اور اس کا اصل جوہر یا بالفاظِ دیگر اس کا لُبِّ لباب اس کی عقل ہے۔ پس اس آیتِ مبارکہ میں ''اولی الالباب'' سے وہ ہوش منداور باشعور لوگ مراد ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور خواہشات و شہوات کی بجائے عقل کی پیروی کرتے ہیں۔

فہمِ قرآن کا ایک اہم اور سنہری اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ چنانچہ اس اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم نگاہ دوڑاتے ہیں تو عجب حسنِ اتفاق سامنے آتا ہے کہ زیر مطالعہ آیت مبارکہ سورۂ آل عمران کے بیسویں رکوع

کی پہلی آیت ہے اور سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہی مضمون بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت کو اگر ''آیۃ الآیات'' سے موسوم کیا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی متعدد نشانیاں جمع فرما دی ہیں اور مظاہر فطرت کی ایک طویل فہرست بیان فرما دی ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَبَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُس کشتی میں جو سامان کو دریا میں لے کر چلتی ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور وہ پانی کہ جو اللہ نے بلندی سے برسایا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کی جاندار چیزوں کو پھیلا دیا' اور ہواؤں کے چلنے میں اور اُس بادل میں جو آسمان اور زمین کے مابین معلّق ہے' نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

دیکھئے یہاں آخر میں الفاظ آئے ''لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ'' جبکہ سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے: ''لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ''۔ معلوم ہوا کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں' جن کی عقل پر جذبات وشہوات اور تعصّبات کے پردے نہیں پڑے ہوتے' جو تفکر و تدبّر کرتے ہیں اور جن کا شعور بیدار ہوتا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ہر معاشرے میں اور ہر دَور میں انسانوں کی عظیم اکثریت تو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں اگر ''دو ٹانگوں پر چلنے والا حیوان'' قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ جس ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں وہاں جو کچھ ہوتا دیکھتے ہیں وہی خود بھی کرنے لگتے ہیں۔ ان کی اپنی آزاد فکر اور سوچ نہیں ہوتی۔ وہ غور ہی نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری زندگی کا مآل

کیا ہے؟ مبدا کیا ہے؟ معاد کیا ہے؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ علم کے قابلِ اعتماد ذرائع کون سے ہیں؟ اور اِس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ لیکن ہر دَور اور ہر معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا مزاج تقلیدی نہیں ہوتا۔ جو خود سوچتے ہیں اور خود کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کے مابین جو اصل اور بنیادی سوالات مشترک ہیں وہ اُن کے بارے میں تفکر وتدبر اور غور وخوض کرتے ہیں۔ گویا وہ زندگی کا راستہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر طے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اولوا الالباب ہیں، ہوش مند ہیں، باشعور ہیں۔ یہ کسی سوسائٹی کی ذہین وفطین اقلیت ہوتے ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے: ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش منداور باشعور لوگوں کے لیے''۔ یعنی اگر یہ لوگ کتابِ فطرت کا مطالعہ کریں تو انہیں کائنات میں ہر چہار طرف نشانیاں نظر آئیں گی۔ نشانیاں کس کی؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ مراد ہے اللہ کی نشانیاں۔ یعنی کتابِ فطرت کا مطالعہ اور مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ ایمان باللہ کے ذرائع ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ہر چیز ذاتِ باری تعالیٰ اور اُس کی توحید کی نشانی ہے۔

''آیت'' کا مفہوم

اس مرحلے پر ''آیت'' کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ آیت کے لغوی معنی ہیں ''نشانی''۔ اب غور کیجیے کہ ہم ''نشانی'' کسے کہتے ہیں! کسی شے، یا کسی شخص یا کسی ہستی کی نشانی وہ ہے کہ جس کو دیکھتے ہی ذہن بے اختیار اور بلا ارادہ اس شے یا شخص یا ہستی کی طرف منتقل ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ آپ کے پاس آپ کے کسی دوست کی ایک نشانی تھی۔ بہت عرصہ سے آپ کی اپنے اُس دوست سے ملاقات نہیں ہوئی، نہ کسی نوع کا ربط وتعلق رہا۔ اب آپ کا وہ دوست آپ کی یادداشت کے انبار میں گم ہو گیا ہے یا اس کی یاد شعور کی سطح سے محو ہو چکی ہے۔ لیکن کسی روز آپ کو اپنے سوٹ کیس یا کسی دوسرے سامان میں وہ رومال یا قلم یا کوئی دوسری چیز اچانک نظر آ جاتی ہے جو آپ کے دوست نے اپنی نشانی کے طور پر آپ کو دی تھی تو اس نشانی کو دیکھتے ہی دفعتہً آپ کو اپنا وہ

دوست یاد آ جاتا ہے۔ یہ ہے نشانی کا حقیقی مفہوم اور اس کی اصل غایت۔ قرآن مجید کے نزدیک اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی نشانی ہے۔ یہ نشانیاں آفاق میں بھی ہیں اور اَنفس میں بھی۔ گویا یہ نشانیاں کائنات میں بھی ہر چہار طرف پھیلی ہوئی ہیں اور خود ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳) ''ہم عنقریب انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کے اپنے وجود میں بھی''۔ گویا اس کائنات کی وسعت اور انسان کے اپنے وجود کے باطن میں اللہ کی اَن گنت اور بے شمار نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اور جن پر غور وفکر کے نتیجے میں ایک صاحبِ عقل وخرد کو اللہ یاد آ سکتا ہے اور اس کی معرفت اس کے اپنے قلب کی گہرائیوں سے اُبھر کر اس کے شعور پر جلوہ آرا ہو سکتی ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال

یاد رکھیے کہ قرآن مجید ایمان باللہ اور معرفتِ خداوندی کے لیے اہلِ منطق کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے منطقی دلائل نہیں دیتا' بلکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' قرآن حکیم بدیہیاتِ فطرت پر اپنے استدلال کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ جیسے کسی نشانی کو دیکھ کر بے اختیار اور بلا ارادہ کوئی یاد آ جاتا ہے۔ ایسے ہی اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی نشانی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک سلیم الفطرت انسان کو اللہ یاد آ جاتا ہے اور مزید غور وفکر سے اس کی تفصیلی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ اسے کسی درجہ میں منطق کا جامہ پہنانا چاہیں اور اس کی کوئی عقلی توجیہہ کرنا چاہیں تو اس کا تجزیہ یوں ہوگا کہ یہ وجود' یہ سلسلۂ کون ومکان عقلاً مستلزم ہے ایک خالق کا۔ کوئی تو پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہونا چاہیے۔ آپ سے آپ تو کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ کوئی ہستی ہے جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ گویا یہ کائنات کا وجود خود ہی خالق کے وجود کے لیے دلیل ہے۔ البتہ یہ قطعی وحتمی دلیل نہیں ہے' اس لیے کہ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق خود منطق کو کاٹتی ہے۔ خالص منطق اس

کا تقاضا کرے گی کہ خالق کا وجود ثابت کرنے کے لیے پھر ایک خالق کا وجود ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا' کیونکہ ایک خالق کے وجود کو ثابت کرنے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہے گا۔ لہٰذا ہمارے بہت سے متکلمین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ محض منطق سے وجودِ باری تعالیٰ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے اس امرِ واقعہ کا کہ قرآن مجید وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے منطقی طرزِ استدلال اختیار نہیں کرتا' بلکہ اپنے استدلال کی بنیاد بدیہیاتِ فطرت پر رکھتا ہے۔ وجودِ باری تعالیٰ کا علم فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان فطرت کی بنیاد پر جس چیز کو جانتا اور مانتا ہے اس میں عقلی مسلّمات کے اضافے سے حکمتِ قرآنی کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ الغرض جہاں تک وجودِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے' اس کا اِدراک تو ایک سلیم الفطرت انسان کے قلب کی گہرائیوں سے از خود ابھرتا ہے یا آفاقی واَنفسی آیات کی تحریک سے اجاگر ہو کر شعور کی سطح پر جلوہ آرا ہوتا ہے۔ تاہم آیاتِ الٰہی پر غور وفکر کے نتیجے میں ایک سلیم العقل انسان کو اس واجب الوجود ہستی کی بنیادی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ اوّلاً جب وہ مظاہرِ فطرت میں کامل توافق اور حد درجہ ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کسی ایک ہی خالق کی تخلیق ہے اور وہی اس کا واحد مدبّر و منتظم بھی ہے۔ اس لیے کہ اگر اس تخلیق و تدبیر کے عمل میں ایک سے زائد ذہن یا ارادے اور مشیّتیں یا اختیارات کارفرما ہوتے تو اس عظیم اور لامتناہی کائنات میں کبھی نظم وضبط برقرار نہ رہ سکتا۔

اولوالالباب کے غور وفکر کا حاصل: معرفتِ ربّ

اسی رُخ پر مزید غور وفکر سے ان ہوش منداور باشعور لوگوں کو اس خالقِ کائنات اور مدبّر و منتظم حقیقی کی تین اساسی صفاتِ کمال کا علم ہوتا ہے۔ یعنی ایک یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گویا وہ ''قادرِ مطلق'' ہے اور اس کی قدرت سے کوئی شے خارج یا بعید نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ وسیع وعریض کائنات ہرگز وجود میں نہ آ سکتی جس کی

وسعتوں اور پہنائیوں کا تا حال کوئی اندازہ انسان نہیں کر پایا ہے۔ دوسری یہ کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا ''بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ'' یعنی ہر چیز کا جاننے والا بھی ہے اور اس کے علم میں کہیں کوئی کمی اور نقص نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جس نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو وہ اُس سے بے خبر یا ناواقف ہو' جیسے کہ سورۃ الملک میں فرمایا: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٤﴾﴾ ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟ وہ تو نہایت باریک بین بھی ہے حد درجہ باخبر بھی!'' تیسری یہ کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک حکیمِ کامل بھی ہے' اس لیے کہ اس نے جو کچھ تخلیق فرمایا ہے اس میں ہر چیز حکمت سے پُر ہے اور کوئی چیز بے مقصد اور بلا غایت نہیں ہے' حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا بھی بے کار اور عبث نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کائنات کے مشاہدے اور اس پر غور و فکر کے نتیجے میں ایک ہوش منداور باشعور انسان کا ذہن وجودِ باری تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی مفہوم ہے سورۂ آل عمران کے بیسویں رکوع کی پہلی اور مختصر آیت اور سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی اور طویل آیت کا جس کا پہلے حوالہ دیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی پہلی آیت کے مطابق مظاہرِ فطرت پر تفکر و تدبّر کے نتیجے میں ایک ہوش منداور باشعور انسان کے ہاتھ میں اس کائنات کی گتھی سلجھانے کے لیے الجھی ہوئی ڈور کا جو سرا آتا ہے وہ ہے معرفتِ ربّ' یعنی اس حقیقت کا شعور و ادراک کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو اپنی ذات میں یکہ و تنہا اور بے مثل و بے نظیر بھی ہے اور کمالِ علم' کمالِ قدرت اور کمالِ حکمت سے متصف بھی۔ ابھی اس الجھی ہوئی ڈور کو مزید سلجھانا ہے تو لازم ہے کہ وہ ہوش منداور باشعور انسان الجھی ہوئی ڈور کے اس سرے کو ہاتھ سے نہ چھوڑے' ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ربط ہے کہ اگلی آیت میں ان دانش مندلوگوں کا یہ وصف بیان ہوا اور ان کی کیفیت کا یہ نقشہ کھینچا گیا کہ:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج﴾

''وہ لوگ جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے ہوئے بھی' بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل (لیٹے ہوئے) بھی' اور (مزید) غور وفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں''۔

اِن الفاظِ مبارکہ کا مفہوم و مدعا یہ ہوا کہ جب ان اولوالالباب نے کتابِ فطرت کے مطالعے' مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور اپنے غور وفکر اور تعقّل وتفکر سے اللہ کو پہچان لیا تو پھر وہ ہر دم اور ہر لحظہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذہن و قلب میں ہر آن مستحضر رہتا ہے (اس لیے کہ ذکر اللہ کے معنی ''استحضار اللہ فی القلب'' ہیں' یعنی دل میں اللہ کی یاد موجود رہے) اور اس سرے کو مضبوطی کے ساتھ ہاتھ میں تھام کر وہ کائنات کے ''معمے'' کو مزید حل کرنے اور اس الجھی ہوئی ڈور کو مزید سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر اور تعقّل وتفکر کا عمل جاری رکھتے ہیں!

''ذکر وفکر'' کا باہمی ربط وتعلق

آگے بڑھنے سے قبل توجہ کو ذرا اِدھر مبذول کر لیا جائے تو مناسب ہوگا کہ یہاں ''ذکر وفکر'' جس طرح یکجا صورت میں سامنے آئے ہیں اس کی بڑی اہمیت ہے' کیونکہ انسان کے غور وفکر کا عمل صحیح رُخ پر اُسی وقت آگے بڑھے گا جب یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہوں' اس لیے کہ یہ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہیں۔ گاڑی ایک پہیے پر نہیں چلے گی' بلکہ اس کے دونوں پہیوں کو لامحالہ حرکت کرنا ہوگی۔ گویا ذکر بھی ہو اور فکر بھی ہو' یہ دونوں ضروری اور لازمی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا موجودہ المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں دو حلقے جدا جدا ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو ذکر کے تو لذت آشنا ہیں لیکن فکر کے میدان میں قدم نہیں رکھتے' جبکہ کچھ لوگ وہ ہیں جو غور وفکر کی وادی میں تو سرگرداں رہتے ہیں لیکن ذکر کی لذت سے محروم رہتے ہیں' گویا دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے۔ مولانا رومؒ نے

اِس حقیقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے:

این قدر گفتیم باقی فکر کُن!
فکر اگر جامد بود رو ذکر کُن!

''اتنا تو ہم نے تمہیں بتا دیا' آگے خود سوچو' غور وفکر کرو' اور اگر فکر میں کہیں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور تم محسوس کرو کہ وہ جامد ہو رہا ہے تو جاؤ اور مزید ذکر کرو!''

آگے فرماتے ہیں:

ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشید این افسردہ ساز

''اس ذکر سے فکر میں ایک حرکتِ تازہ پیدا ہوگی اور وہ صحیح رُخ اور صحیح سمت میں آگے بڑھے گا۔ ذکر تو آفتاب کے مانند ہے' وہ فکر کی افسردگی کو دُور کرے گا''۔

یہی بات علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے کہی ہے:

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است
فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر!
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

''قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے۔ اصل شاہنشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو فقرِ قرآنی کیا ہے؟ یہ ذکر وفکر دونوں کے مجموعے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ ذکر کے بغیر فکر مکمل نہیں ہوسکتا''۔

آیت زیر مطالعہ میں ذکر کی اہمیت کو انسان کی ان تین حالتوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے جن سے وہ امکانی طور پر دوچار رہتا ہے___ یعنی کھڑے ہوئے' جس میں چلنا آپ سے آپ شامل ہے۔ بیٹھے ہوئے جس میں مشغول ہونا بھی شامل ہے' اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے جس میں نیند اور بیداری دونوں صورتوں کی استراحت شامل

ہے۔ گویا یہ اولوالالباب اللہ کی یاد کا ہر حال میں اہتمام والتزام کرتے ہوئے کائنات کے عقدے کو حل کرنے کے لیے غور وفکر جاری رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ذکر سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ کی تحمید' تسبیح' تہلیل اور تمجید کے کلماتِ مسنونہ کی ادائیگی بھی جاری رہے اور دل میں اللہ کے حاضر و ناظر' سمیع و بصیر' علیم وخبیر اور حفیظ و رقیب (نگران) ہونے کا یقین بھی موجود رہے۔ اور اس کیفیت کے دوام کے ساتھ ہی وہ کائنات کی تخلیق میں غور وفکر بھی کرتے رہتے ہیں۔

عقل وفطرت کا ایک تقاضا: مکافاتِ عمل

ذکر وفکر کے اس اختلاط سے وہ اولوالالباب جس نتیجے تک پہنچتے ہیں' اس کو آگے بایں الفاظ بیان فرمایا:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾﴾

''(وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد (بلا غایت اور بے کار) پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے (منزّہ ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے اس سے کہ کوئی کارِ عبث کرے) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا!''

یہاں قدرے تشریح وتوضیح کی ضرورت ہے۔ ان اولوالالباب کے سامنے ان کے ذکر و فکر کے نتیجے میں جو حقیقتِ کبریٰ پورے جزم ویقین کے ساتھ ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کائنات کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی گئی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ یہ کُل کائنات بحیثیتِ مجموعی اور خاص طور پر اس کا نقطۂ عروج یعنی انسان بے مقصد پیدا کیا گیا ہو اور اس کے افعال واعمال کا کوئی نتیجہ نہ نکلے؟ چنانچہ یہیں سے اُن کا ذہن مجازات و مکافاتِ عمل اور جزا وسزا کے تصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ یہ بات اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت کے ضمن میں آچکی ہے:

﴿یٰبُنَیَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ﴾ (آیت ١٦)

''اے میرے بچے! (اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ انسان کا کوئی عمل خواہ نیکی کا ہو یا بدی کا) خواہ وہ رائی کے دانے کے برابر ہو' پھر خواہ وہ کسی چٹان (کے پیٹ) میں گھس کر کیا گیا ہو' خواہ آسمانوں (کی پہنائیوں) میں خواہ زمین (کی وسعتوں) میں' اللہ اسے لا حاضر کرے گا۔''

لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ؏ ''گندم از گندم بروید جو زِ جو'' کے مصداق نیکی کے نتائج اچھے نکلیں اور بدی کے نتائج برے نکلیں۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکثر و بیشتر معاملہ الٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ نیکوکاروں کے لیے یہاں مصائب و تکالیف ہیں اور بدکاروں اور حرام خوروں کے لیے عیش و آرام! آپ ذرا سی دیر کو فیصلہ کر کے دیکھ لیجیے کہ مجھے کسی حال میں جھوٹ نہیں بولنا۔ معلوم ہوگا کہ زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ اسی طرح ذرا حرام وحلال کی حدود پر کاربند ہونے کا فیصلہ کر کے دیکھ لیجیے' دو وقت کے کھانے کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے نہ کچھ اصول ہیں' نہ مستقل اقدار ہیں' نہ ہی وہ کسی قسم کی اخلاقی حدود و قیود کے پابند ہیں' بلکہ ان کو جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ دست درازی سے نہیں چوکتے' ان کے یہاں عیش و آرام ہے' ان کے اور اُن کے اہل وعیال کے لیے تمام دُنیوی سہولتیں وافر مقدار میں مہیا ہیں۔ اِن حقائق و واقعات کے مشاہدے سے ہر باشعور اور حساس انسان کے ذہن میں چند سوالات ابھرتے ہیں کہ آیا یہ دنیا اور اس کی تخلیق ناقص ہے؟ یا یہ خیال کہ ''نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے'' صرف ہمارے ذہن کی اختراع ہے جس کا حقیقتِ نفس الامری سے کوئی تعلق نہیں؟

ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان اِن سوالات پر جس قدر غور کرتا ہے' اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک جانب اس کی عقل پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ عظیم کائنات ایک علیم وخبیر' عزیز وقدیر اور حلیم و دانا ہستی کی سنجیدہ اور بامقصد تخلیق ہے — اور دوسری جانب اس کی فطرت یہ قطعی اور حتمی فیصلہ کرتی ہے کہ نیکی و بدی اور خیر وشر کی اقدار حقیقی و واقعی بھی ہیں اور مستقل اور پائیدار بھی۔ گویا نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے اور دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ﴾

(حٰمٓ السجدۃ: ۳۴) ’’اور ہرگز برابر نہیں ہے نہ نیکی اور نہ بدی!‘‘

الغرض عقل اور فطرت دونوں کا تقاضا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہونی چاہیے جس میں اخلاقی نتائج بھرپور طور پر برآمد ہوں‘ چنانچہ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ ملے اور بدکاروں کو اُن کی بدی کی بھرپور سزا ملے۔ یہ بات سورۃ القلم میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی:

﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝﴾

’’کیا ہم فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسی (غیر معقول) رائے قائم کر رہے ہو؟‘‘

چنانچہ یہ ہے ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ تک کا عقلی سفر کہ جب اولوا الالباب اللہ کو یاد رکھتے ہوئے تخلیقِ کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہاں کوئی شے بے مقصد‘ بے کار‘ عبث اور بلا غایت نہیں ہے تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری فطرت اور ہمارے باطن میں نیکی اور بدی اور بِرّ و تقویٰ اور فسق و فجور کا جو شعور موجود ہے وہ بے نتیجہ اور لا حاصل رہے۔ اس دنیا میں ان کا منطقی اور معقول نتیجہ نہیں نکل رہا‘ لہٰذا لازماً ایک دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں نیکی اور بدی کے بھرپور نتائج برآمد ہوں‘ نیکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے۔ جب یہ لوگ اس عقلی نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر استدعا کرتے ہیں:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝﴾

’’اے ربّ ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے (کہ کوئی عبث کام کرے) پس تو ہمیں (آخرت میں) آگ کے عذاب سے بچائیو۔ اے ربّ ہمارے! (اس آخرت کی زندگی میں) جسے بھی تو نے آگ میں جھونک دیا اسے تو بدرجۂ کامل ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور (ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وہاں) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا‘‘۔

حاصلِ کلام یہ کہ اِن آیات میں خلاصہ ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے عقلی

سفر کا۔ یہ قرآن حکیم کا وہ مظہری استدلال ہے جو قرآن مجید کی طویل مکی سورتوں میں تو نہایت شرح و بسط کے ساتھ طویل مباحث کی صورت میں سامنے آتا ہے' لیکن اس مقام پر اِن تین آیات میں جس جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر میرے محدود مطالعے کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ کی عظمت و جامعیت کا بیان ایک مختصر صحبت میں قطعاً ممکن نہیں ہے' تاہم امید ہے کہ ان گزارشات کے ذریعے ان کے جلال و جمال کی ایک ادنیٰ جھلک ضرور سامنے آ گئی ہوگی اور اصولاً یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہوگی کہ اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کے ضمن میں قرآن حکیم کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے اور وہ تلاشِ حق کے ضمن میں غور وفکر کے لیے کون سا راستہ تجویز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس راہ سے یقینِ محکم عطا فرمائے۔ آمین!

❁ ❁ ❁

شعوری ایمان اور اُس کے لوازم

مذکورہ بالا تین آیات (۱۹۰ تا ۱۹۲) کے بارے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول جو نہ صرف ایک بہت بڑے عالم' محقق اور مفسر تھے بلکہ نہایت عظیم مجاہد اور مردِ میدان بھی تھے' یہ ہے کہ ان میں ''ایمانِ عقلی'' کا بیان ہے۔ یعنی ایک سلیم الفطرت انسان جب اپنی عقلِ صحیح کی رہنمائی میں ذہنی وفکری سفر طے کرتا ہے تو کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور اپنے تعقّل و تدبّر اور تذکر وتفکر سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

اب ہم اس سبق کی بقیہ تین آیات (۱۹۳ تا ۱۹۵) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے قول کے مطابق ان میں سے پہلی آیت (۱۹۳) میں ''ایمانِ سمعی'' کا ذکر ہے' یعنی وہ اولوالالباب جو اپنے ذہنی وفکری سفر کے نتیجے میں اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ جب ان کے کانوں تک کسی نبی کی دعوت پہنچتی ہے جو

انہی امور پر مشتمل ہوتی ہے کہ مانو اِس حقیقت کو کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے جو ہر چیز پر قادر بھی ہے اور ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے' وہ العزیز بھی ہے اور الحکیم بھی۔ اور مانو اِس حقیقت کو کہ انسان کی زندگی صرف اس دنیا کی زندگی نہیں ہے اور موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے' بلکہ ؎

''موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دَم لے کر!''

کے مصداق اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت) ''اور اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا''۔ اُس زندگی میں اس دنیا کی زندگی کے اعمال کے بھرپور نتائج نکلیں گے' چنانچہ یا ابدی عیش و آرام ہوگا یا ہمیشہ کی عقوبت و عذاب۔ ان امور پر مشتمل جب کسی نبی کی دعوت ان اولوا الالباب کے کانوں تک پہنچتی ہے تو فطری اور منطقی طور پر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کی دعوت پر والہانہ لبیک کہتے ہیں اور بالکل اس کیفیت کے ساتھ اس کی تصدیق کرتے ہیں جو اِس شعر میں سامنے آتی ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں تھا

اس موقع پر ان کے احساسات و جذبات کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک دعا کی صورت میں ان آیاتِ مبارکہ میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ:

''اے ربّ ہمارے! ہم نے سنا ایک پکارنے والے (کی پکار) کو کہ وہ ایمان کی منادی کر رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر' پس ہم ایمان لے آئے' تو اے ہمارے ربّ (ہماری اب تک کی زندگی میں جو خطائیں ہم سے سرزد ہوئی ہیں اور جو کوتاہیاں صادر ہوئی ہیں ان سے درگزر فرما اور) ہمارے گناہ معاف فرما دے اور ہم سے (ہمارے دامنِ کردار اور نامۂ اعمال کی) ہماری برائیوں کو دور فرما دے' اور جب تو ہمیں وفات دے تو (اپنے) نیکوکار بندوں

کی معیت عطا فرمائیو! اے ربّ ہمارے! اور ہمیں وہ سب کچھ عطا کیجیو جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی وساطت سے کیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو! یقیناً تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں''۔(آیات ۱۹۳'۱۹۴)

یہ ایک نہایت عظیم دعا ہے اور عجب حسن اتفاق ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران کے مابین جو بہت سے اُمور مشابہت کے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سورۃ البقرۃ کے اختتام پر بھی ایک عظیم دعا وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح یہ عظیم دعا ہے جو سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں وارد ہوئی ہے۔

اِس موقع پر دعا کی حقیقت اور اہمیت کو بھی سمجھ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ کسی سابقہ درس میں یہ احادیث بیان ہو چکی ہیں کہ دعا عبادت کا جوہر ہے' بلکہ دعا ہی عبادت ہے۔ درحقیقت دعا اس نسبت کو ظاہر کرتی ہے جو بندے اور ربّ کے مابین ہے اور عبد اور معبود کے مابین تعلق دعا ہی کے ذریعے استوار اور مستحکم ہوتا ہے۔ مزید برآں دعا ایمان اور یقین کا مظہرِ اَتم ہے' اس لیے کہ جب بندہ اللہ سے دعا کرتا ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو سمیع و بصیر اور مجیب الدعوات ہی نہیں' عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر بھی سمجھتا ہے' تب ہی تو اس سے اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدعا کر رہا ہے۔

صِدّیقین کے ایمان کی کیفیت

یہاں فلسفۂ دین اور حکمتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے اہم بات جو ذہن نشین کر لینی چاہیے' وہ یہ ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کو اصطلاح میں ''صدّیقین'' کہتے ہیں' جو نبی کی دعوت کو قبول کرنے میں والہانہ پیش قدمی کرتے ہیں اور قطعاً کوئی توقف نہیں کرتے۔ گویا انہیں اس کے بارے میں کوئی اشتباہ لاحق ہی نہیں ہوتا' چنانچہ نہ وہ کوئی اعتراض وارد کرتے ہیں' نہ کوئی جرح کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ ہم کو دعوت دینے والے کون ہوتے ہیں؟ بلکہ ان کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی نمازی وضو کر کے نماز کے لیے تیار بیٹھا ہو اور صرف انتظار کر رہا ہو کہ جیسے ہی اذان کی آواز

کان میں پڑے وہ فوراً مسجد کا رُخ کرے۔ بالکل یہی کیفیت صِدّ یقین کی ہوتی ہے' جن کی فطرت صالح ہوتی ہے' جن کی عقل سلیم ہوتی ہے' اور جو خود اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں اُن نتائج کے آس پاس پہنچ چکے ہوتے ہیں جن کی دعوت وحی کے ذریعے سے انبیائے کرام اور رُسلِ عظام علیہم السلام تک پہنچتی ہے اور پھر اُن کے ذریعے اِن حضراتِ صدّ یقین کے کانوں تک پہنچتی ہے۔

الغرض اِن صدّ یقین کو نبی کی دعوت کے قبول کرنے میں نہ کوئی تذبذب' تأمل یا تردّد ہوتا ہے نہ کوئی پس و پیش' کیونکہ یہ تو خود اِن کی اپنی فطرت کی پکار ہوتی ہے' اور ان حقائق پر مشتمل ہوتی ہے جو اِن کے اپنے باطن میں مضمر ہوتے ہیں اور وحی کا جامہ پہن کر نبی کے قلبِ اطہر پر وارد ہوتے ہیں اور اب نبی کی زبان سے ایک دعوت کی صورت میں ادا ہو کر ان کے کانوں میں پڑ رہے ہیں' بقول علامہ اقبال مرحوم:

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے' کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی' دل محفل کا تڑپا بھی گئی!

لٰہذا وہ جس کیفیت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اس میں ایک والہانہ انداز ہوتا ہے' جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں نے جس کے سامنے بھی دعوت پیش کی اُس نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے کہ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر فوراً میری تصدیق کر دی''۔اب آپ خود سوچیے کہ ایسا کیوں ہوا؟ معلوم ہوا کہ ان کو ان حقائق کے ادراک' شعور اور پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کون مسلمان ایسا ہو گا جو یہ بات نہ جانتا ہو کہ ''واقعۂ معراج'' کی تصدیق کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت سے ''صِدّیق'' کا لقب اور خطاب ملا تھا! اور پوری اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیقِ اکبر ہیں۔ مزید برآں مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ سورۃ الّیل کے آخری حصے میں شامل آیات بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں' چنانچہ امام رازیؒ نے سورۃ الّیل کو سورۂ صِدّیق اکبرؓ قرار دیا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت اگرچہ پورے عرب میں بالعموم شرک اور جہالت کی شدید اور گہری تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور مکّہ میں تو یہ ظلمت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور عالَم یہ تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کے لیے جو مرکز تعمیر ہوا تھا وہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق کہ ع

''دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا''

تین سو ساٹھ بُتوں کا استھان بنا ہوا تھا اور ہر سو شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فطرتِ انسانی بالکل مسخ ہو چکی تھی اور توحید کا نور بالکل ہی مٹ چکا تھا۔ اس لیے کہ اسی مکّہ کی سرزمین میں عین اسی وقت ابوبکرؓ بھی موجود تھے جنہوں نے ساری عمر کبھی شرک نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ پر ابھی وحیٔ نبوت کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا لیکن جیسے خود نبی اکرم ﷺ پیدائشی طور پر موحّد تھے اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی پہلے ہی سے موحّد تھے۔ ایسے ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی ابتدا ہی سے موحّد تھے اور ایسی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ایک صاحب زید بن عمرو بن نفیل تھے جن کا آنحضور ﷺ پر وحی کے آغاز سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔ روایات میں ان کا حال یہ آتا ہے کہ کعبہ شریف کے پردے پکڑ پکڑ کر اللہ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ ''اے ربّ! میں صرف تیری عبادت کرنا چاہتا ہوں' میں ان تمام معبودانِ باطل سے اعلانِ براءت کر رہا ہوں جن کو اہلِ مکّہ پوجتے ہیں اور جن سے انہوں نے تیرے گھر کو آباد کر رکھا ہے' میں صرف تیری ہی پرستش اور صرف تیری ہی پوجا کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کیسے کروں''۔ ان ہی کے صاحبزادے ہیں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جو یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں اور جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بہنوئی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ زید جیسے موحّد کی آغوش میں تربیت پانے والے کی فطرت میں ان تمام حقائق کا موجود ہونا بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوںؓ نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں سبقت کی۔

روایات میں چند اور حضرات کا ذکر بھی ملتا ہے جو اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقل صحیح نیز اپنے غور وفکر سے توحید اور معاد کی معرفت حاصل کر چکے تھے' لیکن ان کا انتقال نبی اکرم ﷺ پر آغازِ وحی سے قبل ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں حضرت ورقہ بن نوفل کا ذکر بھی مناسب ہے جو اُسی مکّہ کی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے جہاں شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' لیکن ان کی فطرتِ سلیمہ نے شرک سے انکار کیا اور انہیں مجبور کیا کہ اس ماحول سے نکل کر حقیقت کی تلاش کریں۔ چنانچہ وہ شام گئے' وہاں انہوں نے عبرانی زبان سیکھی اور عیسائیت اختیار کی اور پھر جب پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آنحضور ﷺ کو اُن کے پاس لے کر گئیں تو انہوں نے فوراً تصدیق کی اور یہ فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوا تھا...... اور کاش کہ میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو ستائے گی اور اس شہر سے نکلنے پر مجبور کر دے گی تو میں آپ ﷺ کی مدد کر سکوں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

بہرحال یہ ہیں وہ اولوالالباب' ہوش منداور باشعور لوگ جو ایک جانب تعقّل و تفکر کی وادیاں طے کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کی فطرت سلیم ہوتی ہے اور اس میں ودیعت شدہ حقائق روشن ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ جب انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت سنتے ہیں تو کسی ردّ وقدح کے بغیر فوری طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں۔

اس کی ایک مثال قرآن مجید میں اور بھی ہے۔ ساتویں پارے کی پہلی آیت ہے:

﴿وَإِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾﴾ (المائدة)

''اور جب انہوں نے سنا جو نازل ہوا ہے رسول (ﷺ) پر تو تم دیکھتے ہو کہ معرفتِ حق (کے شدتِ تأثر) کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلی ہیں۔ (گویا معرفتِ حق کا اتنا گہرا اثر اُن کے قلوب پر ہوا اور جذبات کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ ان کی آنکھوں سے بے اختیار

اشکوں کی جھڑی لگ گئی اور) ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے‘ پس ہمارے نام بھی حق کے گواہوں میں درج فرمالے۔‘‘

اجابت از درِ حق......

اس کے بعد آیت ۱۹۵ میں بارگاہِ ربّ العزت کی طرف سے اس دُعا کی قبولیت کا اعلان ہو رہا ہے اور اس کے ضمن میں ایسے سلیم الفطرت اور سلیم العقل لوگوں کی عملی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی۔ پہلے تو قبولیت و اجابتِ دعا کی بشارت اور نوید بایں الفاظ مبارکہ سنائی گئی: ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ......﴾ ’’پس اُن کے ربّ (اُن کے آقا‘ اُن کے مالک) نے اُن کی دعا قبول فرمالی‘‘۔

یہ بالکل ایسی کیفیت ہے جیسی فارسی کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

اس شعر کا اردو ترجمہ شعر ہی کی صورت میں کیا گیا ہے:

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آ کر!

تو اِن صدیقین کی دعا کا جواب گویا فوری طور پر مل رہا ہے۔ اِدھر دعا زبان سے نکلی‘ اُدھر اسے شرفِ قبولیت عطا ہو گیا۔ فرمایا:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ﴾

’’پس ان کی دعا کو قبول فرمایا اُن کے ربّ نے کہ میں تو تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو‘ خواہ عورت ہو۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو‘‘۔

غور فرمایئے کہ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں مَرد اور عورت کے مابین

اخلاقی، دینی اور روحانی مساوات کا اہم اصول بھی بیان فرما دیا گیا کہ دونوں جان لیں کہ اگرچہ تمہاری اصناف جدا جدا ہیں، لیکن یہ جسمانی اور نفسیاتی فرق و تفاوت تو تمدنی ضرورت کے تحت ہے، ورنہ انسان ہونے کے اعتبار سے جیسے تمہاری نوع ایک ہے اسی طرح سے تمہاری اخلاقی اور دینی حیثیت بھی یکساں اور مساوی ہے۔ دین میں، نیکی میں، خیر میں اور دین کے لیے مالی اور جانی قربانیاں دینے میں اور ان کے اجر و ثواب میں مَردوں اور عورتوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ مَردوں کے لیے بھی میدان کھلا ہے اور عورتوں کے لیے بھی۔ مَردوں کے اپنے اعمال ہیں، ان کی اپنی نیکیاں ہیں، ان کی اپنی کمائی ہے اور عورتوں کے اپنے اعمال ہیں، ان کی اپنی نیکیاں ہیں، ان کی اپنی کمائی ہے۔ دونوں کو میری بارگاہ سے ان کے ہر ہر عمل کا بھرپور بدلہ ملے گا۔ میں ان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔

صِدّیقین کے سیرت و کردار کی ایک جھلک

اب اسی آیت کے اگلے حصے کا مطالعہ کیجیے جس کے بارے میں اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت میں پہلے تو اُن صدّیقین کو ان کی دعا کی اجابت و قبولیت کی بشارت و نوید سنائی گئی اور پھر افادۂ عام کے لیے ایسے حضرات کی عملی زندگی اور ان کے سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی دکھا دی گئی۔

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾﴾

’’پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی، اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں، اور جنہوں نے جنگ کی اور قتل کر دیے گئے (جنہوں نے میری راہ میں اپنی گردنیں کٹوا دیں) میں اُن کی برائیوں کو لازماً ان سے دُور کروں گا اور ان کو لازماً داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ بدلہ ہو گا اللہ کے پاس سے (اس کے خاص خزانۂ فضل سے) اور (واقعہ یہ ہے کہ) اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے

پاس ہے''۔

آیت کے اس حصے میں ''ہجرت'' اور ''اخراج مِن الدّیار'' کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ بظاہر تو یہ ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں' ان کی مراد ایک ہی ہے' لیکن ''ہجرت'' ہمارے دین کی ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر گھر بار' اہل وعیال اور اعزّہ واقارب سب چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانا جہاں عبادتِ ربّ کا فریضہ انجام دینے میں غیر معمولی اور ناقابلِ برداشت مشکلات نہ ہوں۔ لیکن اس کے دوسرے بھی متعدد مفاہیم ہیں۔ جیسے نبی اکرمﷺ سے پوچھا گیا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ؟ ''اے اللہ کے رسولﷺ! یہ فرمائیے کہ سب سے اعلیٰ وافضل ہجرت کون سی ہے''؟ اب جواب سنئے' حضورﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ))[1] ''یہ کہ تو ہر اُس چیز کو چھوڑ دے اور ہر اُس کام سے اجتناب کرے جو تیرے ربّ کو پسند نہیں ہے''۔ لہٰذا یہاں اس لفظ کو اس کے عموم پر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس طرح ﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا﴾ کا مفہوم ہوگا کہ ''وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی خاطر ہر اُس چیز کو تج دیا اور ہر اُس چیز سے ترکِ تعلق کر لیا جو اللہ کو پسند نہیں''۔ کوئی چیز اُن کے لیے راہِ حق میں رکاوٹ نہ بن سکی اور اس راہ کی کوئی مشکل ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکی۔ وہ جب اپنے ربّ سے جڑے ہیں تو اس شان کے ساتھ جڑے ہیں کہ جو چیز بھی اللہ کو ناپسند ہے اس سے کٹ گئے۔ ان کی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ: اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ ''اگر کسی سے محبت ہے تو صرف اللہ کے لیے اور اگر کسی سے بغض وعداوت ہے تو صرف اللہ کے لیے''۔

آگے بڑھیے: ﴿وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ ''اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے''۔ یہاں ایک اشکال کا رفع ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اہل ایمان کو قریشِ مکّہ نے خود تو نہیں نکالا تھا۔ اہل ایمان نے خود دوبار حبشہ کی طرف اور آخری بار یثرب (مدینہ منورہ) کی طرف ہجرت کی تھی۔ قریش تو اُن کو روکنے کے درپے تھے۔ لیکن امرواقعہ یہ

(۱) سنن النسائی' کتاب البیعة' باب ھجرة البادی۔ عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما

ہے کہ قریشِ مکّہ نے ان اہل ایمان پر مظالم وشدائد کی وہ حد کر دی تھی کہ ان کا مکّہ میں رہنا دوبھر اور اجیرن ہو گیا تھا۔ ان کے مظالم جن اہل ایمان کے لیے برداشت کی حدود سے نکل گئے تھے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے''۔

آگے فرمایا: ﴿وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ﴾ ''اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں''۔ چنانچہ جو کچھ بیتا حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر اور جو قیامت گزری حضرت خباب بن الارت اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر' پھر جس بہیمانہ طریقے پر حضرت یاسر اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما شہید کیے گئے' ان تمام ایذاؤں اور مظالم وشدائد کا اندازہ کیجیے جس کے تصور ہی سے ایک حسّاس و دردمند دل لرز اٹھتا ہے' اور پھر سوچیے کہ ان حضرات کرام رضی اللہ عنہم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ زر' زن اور زمین کے جو جھگڑے دنیا میں مشہور ومعروف ہیں' ان میں سے کسی کے ضمن میں ان کا کسی سے کوئی تنازُع اور قضیہ نہیں تھا۔ اُن کا جرم کوئی تھا تو صرف یہ کہ انہوں نے کلمۂ توحید کو قبول کر لیا تھا اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ مزید برآں خود نبی اکرم ﷺ جو اعلانِ نبوت ورسالت سے قبل قریش کی آنکھوں کا تارا تھے' جن کا ذکر وہ الصادق اور الامین جیسے اعلیٰ القاب کے بغیر نہیں کرتے تھے' وہ ان کے مخالف کس لیے اور کس وجہ سے تھے؟ یہاں ''فِيْ سَبِيْلِيْ'' کے الفاظ کے ذریعے ان تمام اہل ایمان کو خراجِ تحسین ادا کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جو صرف میری خاطر مصائب کا نشانہ اور تشدّد وستم کا نوالہ بنے اور صرف میرے دین کی خاطر جاں گسل آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزرے۔ واضح رہے کہ یہاں تک جن ایذاؤں کا ذکر ہوا ان کا تعلق مکّی دَور سے ہے۔

اب آگے مدنی دَور کا ذکر آ رہا ہے۔ سورۂ آل عمران مدنی ہے۔ اس دَور میں جنگ اور قتال کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنگ کیا ہے؟ آیۂ بِر کے مطالعے کے دوران ہمارے سامنے یہ بات آ چکی ہے کہ نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے

ایک بندۂ مؤمن معرکۂ قتال اور میدانِ جنگ میں آ جائے تو یہ نیکی کی بلند ترین چوٹی ہے۔ یہاں یہی بات ان الفاظ میں وارد ہوئی: ﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ ''اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور قتل کر دیے گئے''۔ انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوا دیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ پس جن لوگوں کا یہ مقام ہے' جن کے یہ مراتب ہیں' جن کے ایثار و قربانی کی یہ شان ہے تو ان کو بشارت ہو کہ ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ﴾ ''میں لازماً ان سے ان کی برائیاں دُور کر دوں گا''۔ بربنائے بشریت کہیں کوئی لغزش ہوگئی ہو' کبھی جذبات کی رو میں آ کر کسی غلط حرکت کا صدور ہو گیا ہو تو اس سے ہم چشم پوشی فرمائیں گے' ان کو معاف کر دیں گے۔ ان کے دامنِ کردار پر اگر کوئی داغ دھبہ ہے تو ہم اسے دھو ڈالیں گے۔ ان کے نامۂ اعمال میں اگر سیاہی کے کچھ داغ ہیں تو ہم ان کو صاف کر دیں گے۔ یہاں جو پہلے ''لامِ مفتوح'' اور آخر میں ''نونِ مشدّد'' آیا ہے عربی زبان میں یہ تاکید کا سب سے بڑا اسلوب ہے۔ مفہوم ہوگا کہ ''میں لازماً دُور کر کے رہوں گا''۔

آگے فرمایا: ﴿وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ۚ﴾ یہاں بھی تاکید کا وہی اسلوب ہے: ''اور میں لازماً ان کو داخل کر کے رہوں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں''۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے: ﴿ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ؕ﴾ ''یہ بدلہ ہے خاص اللہ کے پاس سے''۔ یہاں پر جو ''مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ'' کے الفاظ آئے ہیں ان میں ایک خاص کیفیت ہے' یعنی مَیں اپنے خاص خزانۂ فضل سے انہیں نوازوں گا۔ یہ لوگ میرے مقربینِ بارگاہ ہوں گے' ان کو جو کچھ میں عطا کروں گا وہ اپنے خاص خزانۂ فیض سے عطا کروں گا۔ ﴿وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ﴿۱۹۵﴾﴾ ''اور (یہ جان لو کہ) اچھا بدلہ (اور عمدہ صلہ) صرف اللہ کے پاس ہے''۔ یہاں بھی حصر کا مفہوم موجود ہے۔ حصر کے اسلوب کے متعلق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس اسلوب سے ''صرف'' کا مفہوم پیدا ہوا۔ یعنی ''اچھا بدلہ تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے''۔

اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ انسان محنتیں کرتا ہے' بھاگ دوڑ کرتا

ہے تو کسی نہ کسی فائدہ، نفع اور بدلہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اولاد پر انسان محنت کرتا ہے، اپنے آپ کو کھپاتا ہے، اس امید میں کہ یہ ہمارے بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنیں گے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد کی طرف سے خلافِ توقع ایک غلط طرزِ عمل سامنے آتا ہے۔ انسان کو صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔ اولاد کے غلط طرزِ عمل اور رویے کی وجہ سے انسان نفسیاتی و ذہنی کرب سے دوچار ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف وہ محنت اور وہ کوشش لازماً نتیجہ خیز ہوگی جو اللہ کے لیے کی گئی ہو۔ اس کا اچھا بدلہ مل کر رہے گا۔ ہر وہ ساعت لازوال اور غیر فانی ہو جائے گی جو اللہ کے لیے صرف کی گئی ہو اور اس کے دین کی خدمت میں لگائی گئی ہو۔ اسی طرح ہر وہ پیسہ محفوظ ہو جائے گا جو اللہ کے دین کے لیے خرچ ہوا ہو۔ یہ تمام مفاہیم اس آیۂ مبارکہ کے اختتامی الفاظ میں موجود ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ OO

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ - اور - غلبۂ دینِ حق کے دَورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**